اسوۂ حسنہ سے ماخوذ دستوری، قانونی اور انتظامی اصول
ایک تحقیقی مطالعہ

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی

The adapted constitutional, legislative and administrative principles from Sirah

The holy Qur'an has clearly mentioned about the life of the Prophet Muhammad ﷺ as an excellent role model for the Muslims. This model provides guidance in all the areas of human endeavours. The prophetic teachings take a multidimentional approach in solving human problems in all spheres of life. This article discsses the constitutional, legislative and administrative issues from the socio-political perspective and attempts to draw certain principles from the practical life of the holy Prophet Muhammad ﷺ. The principles discussed are: strategic planning, fruitful advice, critical assesement, crucial analysis, judgement , gradual implementation, facilitation and accountability. The prophetic module shows that the ultimate purpose of applying these principles was the development of a prosperous society. Evolutionary progress towards Good is a prominent feature of Sirah

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا(۱)

یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں بہترین نمونہ موجود ہے۔ ہر اس فرد

کے لئے جو اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتا ہے۔

قرآن حکیم کی یہ آیت مبارکہ غزوۂ احزاب کے موقع پر نازل ہوئی جو ۵ ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ حافظ ابن کثیرؒ اس آیت مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

هذه الآية الكريمة أصل كبير في التأسي برسول الله ﷺ في أقواله، وافعاله و أحواله ، و لهذا أمر تبارك و تعالى بالتأسي بالنبي ﷺ يوم الاحزاب في صبره، و مصابرته، ومرابطه، و مجاهدته، وانتظاره الفرج من ربه عزوجل (۲)

یہ آیت مبارکہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے اسوۂ حسنہ کے بارے میں ایک بڑے اہم اصول کو بیان کررہی ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی کے تمام اقوال، افعال اور احوال ہمارے لئے بہترین نمونہ ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے غزوہ احزاب کے موقع پر حکم دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غزدے کے موقع پر صبرواستقامت، جہاد کی تیاری اور مجاہدہ، اور شدت وسختی میں اللہ تعالیٰ سے رحمت وکشادگی کا تحمل کے ساتھ انتظار، ان تمام امور میں ہمارے لئے بہترین نمونہ موجود ہے۔

آیت مبارکہ میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی حقیقی پیروی ہر مدعی کے لئے پھولوں کی سیج نہیں ہے، اس راہ کی آزمائشوں سے وہی لوگ صحیح طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین کامل رکھتے ہوں، روز قیامت اس کی بارگاہ میں حاضری کے منتظر ہوں اور ان کے قلوب ہر وقت ذکر الٰہی سے سرشار رہتے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ راہ حق میں عزیمت و استقامت ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جنہیں مضبوط ایمان کی وجہ سے فکری استحکام حاصل ہو اور مکارم اخلاق اور یاد الٰہی کی وجہ سے عملی زندگی میں بھرپور تازگی میسر ہو۔

رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر سیرت نگاروں نے ہر دور اور ہر زمانے میں بہت کچھ لکھا ہے، انہوں نے عبادات، عادات واطوار اور احکام ومعاملات میں آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، حتیٰ کہ فروعات میں بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے محبت وتعلق رکھنے والوں کے لئے تو آپ کا کوئی عمل بھی چھوٹا یا معمولی نہیں ہوتا، مثلاً یہ کہ آپ کو کھانوں میں کیا چیز زیادہ مرغوب تھی، لباس کس قسم کا ہوتا تھا، کون سے رنگ زیادہ پسندیدہ تھے، عمامہ کیسے باندھتے تھے، اس میں پسندیدہ رنگ کون سے تھے وغیرہ وغیرہ۔ اگر کوئی مؤمن لباس و طعام،

رہن سہن، کھانے پینے، سفر وحضر اور نشست و برخاست میں آپ ﷺ کی عادات کو اپناتا ہے تو وہ یقیناً اپنے گہرے تعلق اور محبت کی وجہ سے ایسا کرتا ہے، وہ رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ ہی اپناتا ہے۔

اسوۂ حسنہ کے مندرجہ بالا پہلوؤں پر ہمارے سیرت نگار حضرات کا بہت وقیع کام ہے، یہ کام رکا نہیں، اس پر مسلسل نئے نئے انداز سے غور وفکر کا سلسلہ جاری ہے۔

اس مقالے میں ہم مذکورہ پہلوؤں سے ہٹ کر ان اصولوں پر بحث کرنا چاہتے ہیں، جو ہمیں رسول اللہ ﷺ کے اجتماعی اور انتظامی فیصلوں میں نظر آتے ہیں۔ یہ اصول ہمارے خیال میں اسوۂ حسنہ کا وہ پہلو ہیں جن کی پیروی عمومی طور پر ہر مومن پر واجب ہے، لیکن ان حضرات پر جو امتِ مسلمہ کے اجتماعی اور انتظامی امور کے ذمے دار ہیں، یا کسی بھی شعبے میں وہ قیادت وسربراہی کے فرائض انجام دے رہے ہیں خاص طور پر لازم ہے۔ ہماری رائے میں یہ اصول دستوری حیثیت کے حامل ہیں، جن پر عمل درآمد کو یقینی بنانا ہم سب کا ملی فریضہ ہے۔ ذیل میں ہم سیرت طیبہ سے ماخوذ ان اصولوں پر بحث کریں گے۔ وباللہ التوفیق

۱۔ حالات کا تجزیہ (Situation Analysis)

رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور آپ کے اسوۂ حسنہ کے مطالعے کے نتیجے میں ایک اصول یہ نظر آتا ہے کہ آپ ﷺ کوئی بھی اہم فیصلہ کرنے سے پہلے حالات و مقام کا گہرا مطالعہ فرماتے، ضروری معلومات جمع فرماتے اور پھر قابل اعتماد معلومات کی بنیاد پر حالات کا تجزیہ فرماتے، پھر کسی نتیجے پر پہنچتے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ عمل آپ ﷺ اپنی امت کی تعلیم کے لئے فرماتے تھے۔ جہاں تک آپ کی رہنمائی کا تعلق ہے وہ تو وحی کے ذریعے ہوتی رہتی تھی۔ آپ ﷺ ہر حالت میں وحی کی پیروی فرماتے تھے، البتہ وحی نازل نہ ہونے کی صورت میں آپ ﷺ اجتہاد فرماتے اور حالات وغیرہ کا تجزیہ آپ کے اجتہاد کے عمل کا حصہ ہوتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ ﷺ اپنے اجتہاد کے نتیجے میں کسی فیصلے پر پہنچتے تو وحی بھی نازل ہو جاتی جس سے آپ کے فیصلے کو مزید تقویت حاصل ہو جاتی اور کبھی وحی کا حکم مختلف ہوتا تو آپ ﷺ اس کے مطابق عمل فرماتے۔

مذکورہ اصول کا اطلاق ہمیں مختلف مواقع پر ملتا ہے۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو جب حبشہ کی جانب ہجرت کرنے کا مشورہ دیا تو آپ ﷺ کا مشورہ انتہائی غور وفکر اور سرزمین حبشہ کے معاشرتی، سیاسی اور انتظامی حالات کے تجزیئے کا نتیجہ تھا۔ اہل مکہ نے جب مسلمانوں پر عرصہ حیات

تنگ کر دیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو قریش کے ظلم وستم سے محفوظ رکھنے اور اطمینان وسکون کے ساتھ دین پر عمل کرنے کے لئے جائے عافیت کی تلاش شروع فرما دی تھی، آپ ﷺ نے بہت سے ایسے علاقوں اور خطوں کے بارے میں سوچا ہوگا جہاں مسلمانوں کو چین وسکون سے زندگی بسر کرنے اور اپنے دین کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کا موقع مل سکے۔ ایک اچھی خاصی جماعت کو ترک وطن اور ہجرت کا حکم دے دینا اور مقام ہجرت کا تعین کر دینا کوئی معمولی فیصلہ نہیں ہوتا، نہ ہی جلد بازی میں کوئی ایسا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سرزمین حبشہ کے حالات وہاں کے معاشرے، نظم ونسق، امن و سلامتی کی حالت اور وہاں کے حکمران کے نظم وانتظام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اور کسی نتیجے تک پہنچنے کی بھرپور کوشش فرمائی، جس کی تائید تاریخی واقعات سے ہوتی ہے۔

حبشہ کے ساتھ عربوں کے تجارتی روابط تھے۔ اہل مکہ تو تھے ہی تجارت پیشہ لوگ، یہاں کے تجارتی قافلے دور دراز علاقوں میں اپنا سامان لے کر جایا کرتے تھے اور وہاں کے تاجر اپنا سامانِ تجارت لے کر یہاں آیا کرتے تھے۔ یہ تجارتی وفود معلومات کا ایک اہم ذریعہ تھے۔ سرزمین حبشہ کے بارے میں آپ کی معلومات اور وہاں کے حالات کے تجزیئے کا اندازہ ان روایات سے بہ خوبی ہوسکتا ہے جن میں آپ ﷺ نے حبشہ اور وہاں کے حکمرانوں کے بارے میں تبصرہ فرمایا۔

ابن ہشام کے ان الفاظ پر غور کیجیے جو انہوں نے نقل کئے ہیں۔ یہ الفاظ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت فرمائے تھے جب آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو حبشہ ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے الفاظ یہ تھے:

> **لو خرجتم الی ارض حبشة، فان بها ملكا لا يظلم عنده أحد، وهي أرض صدق، حتى يجعل الله لكم فرجا مما أنتم فيه (۳)**
>
> بہتر ہوگا اگر تم سرزمین حبشہ کی جانب نکل جاؤ، اس لئے کہ وہاں ایک ایسا بادشاہ حکمران ہے جس کی مملکت میں کسی فرد پر ظلم نہیں ہوتا۔ یہ سچائی والی سرزمین ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ان مصائب سے نکلنے کی راہ پیدا فرما دیں۔

مندرجہ بالا عبارت کا غور سے مطالعہ کیجیے اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کی نظر کس قدر گہری تھی، وہاں کے حالات اور طرز حکمرانی کے بارے میں آپ ﷺ کا تجزیہ کتنا واضح تھا۔ بعد کے حالات اور تاریخ نے آپ ﷺ کے تبصرے کے ایک ایک لفظ کو صحیح ثابت کیا۔ آپ ﷺ نے حبشہ کے بارے میں فرمایا تھا کہ وہ صدق ووفا کی سرزمین ہے، وہاں کا حکمران عدل وانصاف کے تقاضوں کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔ بعد کے

واقعات نے آپ کے الفاظ کی صداقت پر مہر لگا دی، حضرت عبداللہ بن الحارثؓ کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھئے، وہ بلادِ حبشہ میں اپنے پرامن و پرسکون قیام کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

کل امرئ من عباد اللہ مضطھد
ببطن مکۃ مقھور و مفتون
انا وجدنا بلاد اللہ واسعۃ
تنجی من الذل والمخذاۃ والھون(۴)

اللہ تعالیٰ کے ان تمام بندوں کو میرا پیغام پہنچا دو جو وادیٔ مکہ میں مجبور و مقہور ہیں اور مصائب میں گرفتار ہیں۔ کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے شہروں کو بڑا وسیع پایا، جہاں ہمیں اہانت، ذلت اور رسوائی سے نجات مل گئی۔

ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ نے ہجرت حبشہ اور وہاں قیام کے بارے میں فرمایا:

جب ہم سرزمین حبشہ پہنچے تو ہمیں نجاشی کا بہترین پڑوس میسر آ گیا، ہمیں اپنے دین کے معاملے میں امن نصیب ہوا اور ہم سکون کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔ یہاں نہ کوئی ہمیں تکلیف پہنچاتا، نہ ہمیں کوئی ناگوار بات سننے کو ملتی۔(۵)

رسول اللہ ﷺ نے سرزمین حبشہ کے بارے میں جو تجزیہ پیش فرمایا تھا اس کی تصدیق اس تاریخی واقعے سے بھی ہوتی ہے جب قریش مکہ نے حکومتِ حبشہ سے سفارتی رابطہ قائم کیا اور مسلمانوں کو وہاں سے نکلوانے کے لئے بھرپور کوشش کی۔ مکہ مکرمہ کی شہری مملکت نے جب یہ محسوس کیا کہ مسلمان سرزمین حبشہ میں نہ صرف یہ کہ پرامن و پرسکون زندگی بسر کر رہے ہیں بل کہ اپنے دین کے مطابق عملی زندگی بھی گزار رہے ہیں تو انہوں نے سفارتی دباؤ ڈالنے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بنایا اور دو بہترین سفارت کاروں کا انتخاب کیا۔ عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ منجھے ہوئے سفارت کار تھے، قریش مکہ نے انہیں یہ ذمے داری سونپی کہ یہ بادشاہ حبشہ اور اس کے وزرا کو قائل کریں اور اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ مسلمانوں کو اپنی سرزمین سے نکال دیں، یہ دونوں سفارت کار پوری تیاری کے ساتھ حبشہ گئے، بادشاہ اور اس کے وزرا و مقربین کے لئے قیمتی تحائف لئے جو انہیں پیش کئے گئے۔ دونوں سفارت کاروں نے اپنی تمام صلاحتیں بادشاہ کو آمادہ کرنے میں صرف کر دیں، مگر شاہ حبشہ نے اپنی کابینہ کی سفارش کے باوجود ان کا مطالبہ یہ کہہ کر رد کر دیا کہ وہ جب تک مسلمانوں کا موقف نہیں سن لیتے اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔(۶)

دیکھئے رسول اللہ ﷺ کا حکومت حبشہ کے بارے میں تجزیہ کس قدر صحیح ثابت ہوا۔ آپ ﷺ نے

فرمایا تھا کہ وہ ایک عادل بادشاہ ہے، اس کی سرزمین پر کسی پر ظلم نہیں ہوتا، وہ سرزمین سچائی وصداقت کی سرزمین ہے۔

مدینہ منورہ کی جانب ہجرت سے قبل تمام صورت حال کا جائزہ اس سے کہیں زیادہ گہرائی کے ساتھ لیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے اہل مدینہ کے ساتھ رابطوں کا تاریخی ثبوت موجود ہے۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حج وعمرے کے موسم میں مختلف خطوں اور علاقوں سے لوگ وفود کی شکل میں حج وعمرے کے لئے مکہ مکرمہ آیا کرتے تھے اور انہیں اسلام کی دعوت پیش فرماتے۔ باقاعدہ دین کی دعوت سے قبل رسمی گفت گو ہوتی جس میں زیادہ تر اپنے علاقوں، لوگوں اور وہاں کے رسوم ورواج اور عادات واطوار کے بارے میں گفت گو ہوتی۔ یہ رسمی گفت گو ہی حالات کو جاننے کا اہم ذریعہ ہوتی تھی۔ تجارت کی غرض سے آنے والے وفود بھی معلومات کے حصول کا ایک اہم ذریعہ ہوتے تھے۔

مکہ مکرمہ ایک تجارتی شہر تھا، یہاں کثرت سے اسواق (تجارتی میلے) لگا کرتے تھے، ان میں تین بڑے اسواق، عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز ہوتے تھے جن میں مختلف خطوں اور علاقوں کے تاجر اپنا سامان لے کر بغرض تجارت آیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا ان تجارتی میلوں میں تشریف لے جانا ثابت ہے۔ دعوتِ دین پیش کرنے کے لئے یہاں ایک اچھا موقع فراہم ہوجاتا تھا۔لیکن یہ ملاقاتیں مختلف علاقوں کے جغرافئے، وہاں کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورت حال سے آگاہی کا بھی اہم ذریعہ ہوتی تھیں۔ مذکورہ تین اسواق کا دورانیہ بھی خاصا طویل ہوتا تھا۔ عکاظ کا بازار ذوالقعدہ کے شروع میں لگتا اور بیس دن جاری رہتا تھا، یہ ختم ہوتا تو ساتھ ہی مجنہ کا بازار شروع ہوجاتا، یہ بازار دس دن جاری رہتا تھا، اس بازار کے اختتام کے ساتھ ہی ذوالمجاز کا بازار لگ جاتا۔ یہ تجارتی میلہ آٹھ دن جاری رہتا، اس طرح تقریباً چالیس روز تک ان تجارتی میلوں کی بہار چھائی رہتی۔ (۷) ان تین بڑے بازاروں کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے بازار بھی لگا کرتے تھے۔

عقبہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ کی اہل مدینہ سے تین سال کی تین ملاقاتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں، ان میں دوسری اور تیسری ملاقات میں باقاعدہ معاہدہ بھی طے پا گیا تھا۔ ان ملاقاتوں نے بھی آں حضرت ﷺ کو مدینہ منورہ کے حالات اور وہاں کے لوگوں کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ (۸) مدینہ منورہ ہجرت سے قبل وہاں کے حالات کا بھرپور جائزہ کا اصول کارفرما نظر آتا ہے۔

۲۔ منصوبہ بندی (Planning)

رسالت مآب ﷺ کی حیات طیبہ میں دوسرا اہم اصول منصوبہ بندی کا رہا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کبھی جلد بازی میں بغیر کسی حکمت و تدبیر کے کوئی کام انجام نہیں دیتے۔ یہی اصول ہمیں اسوۂ رسول ﷺ میں نظر آتا ہے۔

آں حضرت ﷺ نے اپنی زندگی میں بہت بڑے بڑے فیصلے فرمائے۔ کچھ فیصلے تو حکم الٰہی اور وحی الٰہی پر عمل درآمد کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئے، لیکن ہمارے خیال میں وحی پر عمل درآمد کے لئے بھی منصوبہ بندی کر لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ وحی پر عمل تو فرض ہے، رسول اللہ ﷺ نے وحی الٰہی پر عمل کی بہترین صورت منصوبہ بندی کے ذریعے اختیار فرمائی۔ منصوبہ بندی اور اس پر عمل آپ ﷺ کے تمام فیصلوں میں نظر آتا ہے، ہم یہاں بہ طور مثال ہجرتِ مدینہ میں اس اصول کی وضاحت پیش کرنا چاہیں گے۔

مکہ مکرمہ میں قریش کے جارحانہ رویہ اور ظلم و ستم سے تنگ آکر رسول اللہ ﷺ نے کسی ایسے مقام کو اپنا مرکز بنانے کے لئے غور و فکر کرنا شروع کیا، جہاں نہ صرف آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام امن و سکون کے ساتھ زندگی گزار سکیں، بل کہ وہ ایسی جگہ ہو جو دین کے پیغام کو انسانیت تک پہنچانے کے لئے بھی موزوں ہو۔ حبشہ اگرچہ ایک محفوظ علاقہ تھا، وہاں دین کی دعوت اور عملی زندگی گزارنے میں بھی کوئی دشواری نہیں تھی، لیکن دعوت دین کے عالمی مرکز کے لئے وہ مقام مناسب نہیں تھا۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کا جب مشورہ دیا تو اسی وقت اس بات کا اظہار بھی فرما دیا تھا کہ یہ ایک عارضی اور وقتی انتظام ہے، مسلمان مہاجرین اس وقت تک وہاں رہیں جب تک اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور بہتر صورت پیدا نہ فرما دیں۔

ہجرت سے رسول اللہ ﷺ کا مقصد صرف محفوظ و پر امن قیام کی تلاش ہی نہیں تھا، بل کہ آپ کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ ایک ایسا خطہ یا علاقہ تلاش کیا جائے جہاں سے امن و سکون کے ساتھ دین کے عالمی پیغام کو دنیا بھر میں پھیلایا جا سکے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی طائف کا سفر تھا۔ سرزمین طائف اسلامی معاشرے کا مرکز بننے کی صلاحیت تو رکھتی تھی لیکن یہاں کے سرداروں کا ردعمل بہت جارحانہ تھا، اس لئے رسول اللہ ﷺ طائف سے واپس آ گئے، یہاں واپس آ کر آپ نے اہل یثرب کے ساتھ رابطے قائم کئے۔

جغرافیائی لحاظ سے یثرب بہت موزوں مقام تھا، لیکن یہاں آباد اوس و خزرج کے قبائل کی باہمی خانہ جنگی اور یہودی قبائل کی مداخلت اور سیاست نے امن و امان کی صورت حال بہت دشوار اور پیچیدہ بنا دی تھی، اس لئے اس خطے کو مرکز بنانے کے لئے بہت زیادہ غور و فکر اور طویل المیعاد اور قصیر المیعاد منصوبہ

بندیوں کی ضرورت تھی، تاکہ ہجرت کے بعد یہاں کے داخلی و خارجی مسائل و مشکلات سے نمٹنے کے لئے مناسب لائحہ عمل تشکیل دیا جا سکے۔

رسول اللہ ﷺ نے فوری طور پر دو باتوں کی طرف توجہ فرمائی۔ پہلی بات یہ کہ یثرب کی اس وقت کی سیاسی و معاشرتی صورت حال اور خانہ جنگی کی وجہ بدامنی کی حالت میں اس وقت تک ہجرت نہیں کی جا سکتی جب تک وہاں کے بااثر قبائل کے ساتھ باقاعدہ کوئی معاہدہ نہ کر لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اگر وہاں آباد بااثر قبائل کے لوگوں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی معاہدہ طے پا جائے تو پھر کسی ایسے معتمد صحابی کو بھیجا جائے جو نہ صرف یہ کہ دین کا گہرا فہم رکھتے ہوں بل کہ تعلیم و ابلاغ کی بھی بھرپور صلاحیت رکھتے ہوں اور وہاں رسول اللہ ﷺ کے سفیر کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض انجام دے سکیں۔

اس مقصد کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اہل یثرب کے ساتھ عقبہ کے مقام پر تین اجلاس منعقد کئے۔ حالات کے تقاضوں کے تحت یہ تینوں اجلاس خفیہ رکھے گئے تھے۔

عقبہ کے مقام پر پہلی ملاقات قبیلہ خزرج کے ایک گروپ سے ہوئی، اس گروپ میں چھ افراد شریک تھے۔ اس ملاقات میں رسول اللہ ﷺ نے دین اسلام کا تعارف کرایا، توحید، رسالت اور عقیدہ آخرت کی وضاحت فرمائی۔ مکارم اخلاق کی اہمیت و ضرورت کو اجاگر فرمایا، نیز قرآن حکیم کی کچھ آیات بھی تلاوت فرمائیں۔

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دور دراز خطے کے لوگوں اور ان کے علاقوں کے بارے میں وسیع معلومات رکھتے تھے۔ قبیلہ خزرج کے اس چھ رکنی وفد سے ملاقات فرمائی تو آپ ﷺ نے آغاز گفت گو میں پوچھا کہ تم کون لوگ ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ یہود کے ساتھ تمہارا وِلا کا تعلق ہے (اَمِن موالی یہود؟) تو انہوں نے کہا جی ہاں ہمارا ان کے ساتھ حمایت کا تعلق ہے۔ (۹)

آئندہ سال اہل یثرب کا ایک بڑا گروپ جس میں بارہ افراد تھے۔ ان میں دس افراد قبیلہ خزرج کی مختلف شاخوں سے تعلق رکھتے تھے اور دو کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے سامنے دین کی بنیادی باتوں کی وضاحت فرمائی۔ وفد کے تمام ارکان نے اسلام قبول کر لیا اور باقاعدہ بیعت کر کے عہد کیا کہ وہ دین کے بنیادی عقائد کے تقاضوں کو پورا کریں گے۔ ہر قسم کی بداخلاقی اور معاشرتی برائیوں سے اجتناب کریں گے، نیز نیکی کے کاموں میں رسول اللہ ﷺ کی حکم عدولی نہیں کریں گے۔ باقاعدہ بیعت کے بعد وفد کی درخواست پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے انتہائی معتمد صحابی حضرت معصب بن

عمیرؓ کو وہاں لوگوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مقرر فرمایا، حضرت معصب بن عمیرؓ مدرسہ رسول ﷺ کے تربیت یافتہ صاحب علم و عمل تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں ابلاغ و تفہیم کی خاص صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان تمام لوگوں نے رسول اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت اس بات پر تھی کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ ہجرت کر کے یثرب آ جائیں تو انہیں یہاں تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ یہ بیعت رسول اللہ ﷺ کی نصرت و اعانت اور ضرورت پڑنے پر آپ کی خاطر جنگ پر بیعت تھی۔ (۱۰) بیعت عقبہ ثانیہ تمام تر حضرت مصعبؓ کی شب و روز کی محنت اور مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اوس و خزرج کے قبائل جو ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس بیعت کے نتیجے میں اسلام کے زیر سایہ آ گئے، اور رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں متحد ہو گئے۔

بیعت عقبہ ثانیہ نے رسول اللہ ﷺ کے لئے ہجرت کی راہ ہموار کر دی، آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں آ کر بھی منصوبہ بندی کے اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہت سے فیصلے کئے۔ ان سب پر تفصیلی بحث یہاں ممکن نہیں، لیکن اگر قارئین اس اصول کو پیش نظر رکھ کر دستور مدینہ (۱۱) مواخاۃ کے عمل، مدینہ منورہ کے قرب و جوار میں رہائش پزیر قبائل کے ساتھ معاہدات اور مدینہ منورہ کے اطراف میں چھوٹی اور بڑی مملکتوں کے حکمرانوں اور سلطنتوں کے ساتھ سفارتی روابط کا مطالعہ کریں تو واضح طور پر نظر آئے گا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان تمام امور پر بہت غور و فکر اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ عمل درآمد کیا۔ (۱۲)

ہمارے سیرت نگاروں میں بہت سے اہل علم نے رسول اللہ ﷺ کے غزوات پر خصوصی توجہ دی ہے، ان میں بعض حضرات نے خاص طور پر جنگی حکمت عملی پر کام کیا ہے۔ ان کی تحریروں کا مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ آپ ﷺ نے کس قدر تدبر و حکمت کے ساتھ اقدامی یا دفاعی جنگ کے لئے منصوبہ بندی فرمائی تھی۔ (۱۳)

۳۔ مقاصد (Objectives) کا تعین

انتظامی امور، نظم مملکت، آئین، دستور، احکام و قوانین کی تشکیل اور اداروں کے قیام کی صورت میں مقاصد کا تعین کرنا اور پھر ان کی نگہداشت کا اہتمام کرنا اسوۂ حسنہ کا حصہ رہا ہے۔ اگر بہ غور جائزہ لیا جائے تو مقاصد کا گہرا تعلق منصوبہ بندی کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ منصوبہ بندی کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک زیر غور معاملے کے مقاصد کا تعین نہ کر لیا جائے۔

قرآن حکیم جابجا مقاصد کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔ دیکھئے قرآن کریم کبھی انسان کی پیدائش کے مقصد کو بیان کرتا ہے تو کہیں انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے مقاصد کو اجاگر کرتا ہے، کہیں عبادات کے مقاصد پر روشنی ڈالتا ہے تو کہیں احکام وقوانین کی وضاحت کرتا ہے۔ مقصدیت کی طرف قرآن حکیم خود توجہ دلاتا ہے، کہیں سوالیہ انداز میں انسانوں سے خطاب کرتا ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ O (۱۴)

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں لایعنی (بے مقصد) پیدا کیا، اور کیا تمہیں لوٹ کر ہماری طرف نہیں آنا؟

اور کہیں توضیحی اسلوب میں:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا بَاطِلًا ط (۱۵)

اور ہم نے زمین وآسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بے کار پیدا نہیں کیا

عبادات کا جائزہ لیجیے تو الگ الگ عبادات کے مقاصد بیان کئے گئے ہیں، مثلاً نماز کا ایک مقصد تعلق مع اللہ ہے جو یاد الٰہی یا ذکر الٰہی سے پیدا ہوتا ہے اور نماز ذکر الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔:

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (۱۶)

میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔

آیت مبارکہ اس اعلیٰ مقصد کی یاددہانی کرا رہی ہے جو ہر مؤمن کا مقصود ہے، تاکہ اسے اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل ہو۔ نماز معرفت الٰہی کا اہم ذریعہ ہے، اسی لئے اسے اہل ایمان کے لئے معراج قرار دیا گیا ہے۔ نماز کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اہل ایمان ایک پاکیزہ اور مہذب معاشرہ قائم کریں اور دستور و احکام شریعت کے مطابق زندگی بسر کریں:

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ وَ لَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ O (۱۷)

اس کتاب کی تلاوت کیجیے جو آپ ﷺ پر بذریعہ وحی نازل کی گئی ہے۔ اور نماز قائم کیجیے۔ یقیناً نماز بے حیائی اور منکرات سے روک دیتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے۔

انسانی معاشرے میں دو قسم کی برائیاں پائی جاتی ہیں، ایک وہ جن کا تعلق جنسی جرائم یعنی فحاشی اور بے حیائی سے ہوتا ہے، دوسری وہ جن کا تعلق لاقانونیت اور دیگر اخلاقی جرائم سے ہوتا ہے۔ نماز ان دونوں

قسم کی برائیوں سے روک دیتی ہے۔ نماز کا اثر انسان کی داخلی اور خارجی دونوں زندگیوں پر مرتب ہوتا ہے، اس لئے کہ مؤمن اس طرح عبادت کرتا ہے جس طرح عبادت کرنے کی اسے تعلیم دی گئی ہے:

أن تعبدالله كأنك تراه، فان لم تكن تراه فانه يراك (۱۸)

اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ تم اس کا (ذات الٰہی کا) مشاہدہ کر رہے ہو اور اور اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو سکے تو یہ تو ضرور ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ جس شخص کو نماز فحشا اور منکر سے نہ روکے وہ تقرب الٰہی سے محروم رہتا ہے، بل کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہو جاتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ جس شخص کو نماز فحشاء اور منکر سے نہ روکے حقیقت میں اس کی نماز ہی نہیں ہوتی۔ (۱۹)

روزے کی ادائیگی بھی بے مقصد نہیں۔ روزہ رکھ کر روزے دار کے دل میں تقوے پیدا نہ ہو تو روزے کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ انسان تقرب الی اللہ کی تمام منازل دل و دماغ کے ذریعے طے کرتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تقوے کو تقوی القلوب فرمایا ہے۔ (۲۰) ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قلب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

التقوی ھٰھنا (۲۱)

تقویٰ تو یہاں ہوتا ہے۔

لہٰذا روزے دار کی تمام تر توجہ تزکیہ نفس اور اصلاح قلب کی طرف رہتی ہے۔

مناسک حج کا مقصد اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور اس کی عظمت کا اعتراف بھی ہے اور اس کی یاد سے دلوں کو منور کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ قرآن کریم میں جہاں مناسک حج کا ذکر ہے وہاں تقوے اور ذکر اللہ کی فضیلت و اہمیت کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے، تقوے کو بہترین زاد حج ہی کے سلسلۂ احکام میں قرار دیا گیا ہے۔ (۲۲) اللہ تعالیٰ کی یاد سے دلوں کو تازگی بخشنے کا حکم بھی مناسک حج کی ادائیگی کے ضمن میں دیا گیا ہے۔

فَاذْكُرُوا اللّٰه (۲۳)

اللہ تعالیٰ کو یاد کرو

اور

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰاكُمْ (۲۴)

اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جیسا کہ اس نے تمہیں ہدایت دی۔

جب قلوب انسانی میں یاد الٰہی بس جاتی ہے اور زبان اس کے ذکر سے مزین ہوتی ہے تو اسی سے

دلوں میں تقویٰ پیدا ہوتا ہے جو پورے دین کی غایت و روح ہے۔

۴۔ مشاورت (Consultation)

مشاورت اسوۂ حسنہ کا ایسا اصول رہا ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے دوام کے ساتھ عمل کیا۔ آپ ﷺ ان تمام اجتماعی امور میں اپنے صحابہ کرام سے مشورہ فرماتے تھے جن کے بارے میں وحی کے ذریعے کوئی حکم نازل نہ ہوا ہو۔ مقام رسالت تو خود اس قدر عظمت کا مقام ہوتا ہے کہ رسول کو عام لوگوں سے مشورے کی احتیاج نہیں ہوسکتی، ان کے پاس جو علم و ادراک ہوتا ہے وہ انہیں عام لوگوں کی مشاورت سے بے نیاز کر دیتا ہے لیکن اس سب کے باوجود رسول علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام سے مشوروں کا پابند بنایا۔ اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عمل کو بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے سنت اور اسوۂ حسنہ کے اصول کے طور پر قائم کرنا چاہتے تھے، تاکہ آپ کا یہ عمل نہ صرف عام لوگوں کے لئے بل کہ ان حضرات کے لئے بھی جوامت کے اجتماعی، سیاسی اور انتظامی امور کے ذمے دار ہوں، سنت موکدہ کا درجہ حاصل کر جائے۔

شوریٰ کے بارے میں قرآن کریم کی آیت **وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** اور **وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ** بہت اہم ہیں، ان آیات میں بیان کردہ حکم شوریٰ کے سلسلے میں بہت واضح ہے۔ (۲۵)

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اس اصول پر اس قدر پابندی سے عمل کیا جاتا تھا کہ فقہا نے شوریٰ کو شریعت اسلامیہ کا ایک محکم اصول قرار دیا ہے۔ (۲۶)

موجودہ دور میں بالخصوص مسلمان مملکتوں میں شوری کا نظم بہت دھندلا گیا ہے۔ عہد رسالت اور دور خلفا راشدین میں بہت زیادہ اظہار رائے کی آزادی حاصل تھی، اختلاف رائے کا حق بھی حاصل تھا، لیکن کچھ شرائط و صلاحیتوں کو بھی مدنظر رکھا جاتا تھا۔ مثلاً اخلاص اظہار رائے اور مشورے کے لئے ایک اہم اخلاقی قدر تصور کی جاتی تھی، دوسری اہم شرط علم تھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ زیر بحث مسئلے کے بارے میں رائے دینے والا معاملے کے بارے میں علم بھی رکھتا ہے یا نہیں، مثلاً اگر مسئلے کا تعلق معاشیات کے کسی اہم پہلو سے متعلق ہے تو اس صورت میں ان حضرات کی رائے اور مشورے کو اہمیت حاصل ہوگی جو معاشیات کا ادراک وفہم رکھتے ہوں، تیسری شرط یہ ہے کہ رائے مدلل ہو اس لئے کہ دلیل کے بغیر مشورے یا رائے کو تقویت حاصل نہیں ہوتی۔ قرآن حکیم کی وہ آیات جن میں علم و دلیل کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سلسلے میں رہ نمائی مہیا کرتی ہیں۔ (۲۷)

ہمارے دور میں اپنی رائے کو منوانے کے لئے مختلف قسم کے دباؤ استعمال کئے جاتے ہیں، کہیں مفادات پیش کر کے اپنی رائے کو منوانے کی کوشش کی جاتی ہے تو کہیں پریشر گروپ بنالئے جاتے ہیں اور جوڑ توڑ کا گھناؤنا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ مشاورتی اداروں میں علم و دلیل کی بنیاد پر مخلصانہ بحث و مذاکرہ کی مثالیں اب ناپید ہوگئی ہیں۔

مشورہ ایک امانت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

المستشار مؤتمن (۲۸)

جس شخص سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ امین کی حیثیت رکھتا ہے۔

امانت اور ادائیگی امانت کا شعور پیدا کرنے کے لئے اخلاص ضروری ہے۔

ابو حیان سورہ شوریٰ کی متعلقہ آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شوریٰ کا نظام اس طرح منظم کرنا چاہئے کہ اس سے تین نتائج حاصل ہو سکیں۔ اس کا پہلا نتیجہ تو یہ برآمد ہوتا ہے کہ امت کے مابین وحدت و اتفاق پیدا ہوتا ہے (اجتماع الکلمہ)۔ دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے افراد ملت میں باہم محبت اور تعلق بڑھتا ہے (التحاب)۔ اور تیسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ خیر اور بھلائی کے کاموں میں باہمی تعاون کی راہیں کھلتی ہیں (التعاضد علی الخیر)۔ (۲۹)

۵۔ ترجیحات (Priorities) کا تعین

ملکی و جغرافیائی حالات، معاشرتی و سیاسی ضرورتوں اور ملی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ ترجیحات کا تعین فرمایا کرتے تھے۔ ترجیحات کے اصول کا اطلاق دعوت دین کے مختلف مناہج پر بھی ہوتا ہے۔ مختلف معاشروں، اور مختلف حالات میں یہ تعین کرنا پڑتا ہے کہ ان مخصوص حالات، اور خاص مزاج و تہذیب کے لوگوں کے لئے کس قسم کا اسلوب دعوت زیادہ مناسب ہوگا بس وہی اسلوب ترجیح پاتا تھا۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد دعوتِ دین ہی ہوتا ہے وہ اپنے مشن کا آغاز بھی دین کی دعوت سے کرتے ہیں اور پھر دین ہی کی بنیاد پر معاشرہ اور مملکت کی تشکیل کرتے ہیں، لیکن معاشرے اور مملکت کی تشکیل کے مراحل طے کرتے ہوئے وہ ایک اچھے مدبر اور صاحب بصیرت منتظم کی طرح بہ طور پالیسی اپنی ترجیحات کا تعین کرتے ہیں۔

مکی دور کی بعض ترجیحات

مکی دور اسلامی تاریخ کا بہت اہم دور ہے۔ وحی کا نزول اور نبوت کی ذمے داریوں کا آغاز مکی دور

سے ہی ہوتا ہے۔ ایمان، اخلاق، تزکیہ نفس اور تطہیر قلب کا اصل کام اسی دور میں ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایمان و اخلاق کی بنیاد پر تعمیر ملت کا فریضہ اسی دور میں انجام دیا۔ امت کی تربیت و تنظیم کے لئے بہت سے امور انجام دیے، بہت سے اہم فیصلے کئے، لیکن دو امور ایسے تھے جنہیں ہر چیز پر ترجیح حاصل رہی۔ ان میں سرفہرست امت کی تعلیم و تربیت تھی، علم و دانش کو امت مسلمہ کے تمام افراد کے لئے خواہ مرد ہوں یا خواتین، کم عمر ہوں یا جوان اور بوڑھے، سب کے لئے فرض قرار دیا گیا:

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (۳۰)

علم کی طلب و حصول ہر مسلمان پر فرض ہے۔

نیز جنت تک پہنچنے کا راستہ صرف علم ہے، اس کے بغیر فلاح و سعادت کا کوئی امکان نہیں۔

دین میں علم کو ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے، اس کا اندازہ پہلی وحی سے ہوتا ہے، نزول قرآن کا آغاز سورہ علق کی پہلی پانچ آیت سے ہوتا ہے۔ اس سورۃ کا پہلا لفظ اقراء ہے، یہ امر کا صیغہ ہے، اور امر کا صیغہ وجوب کے لئے آتا ہے۔ یہ حکم اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے لئے تھا لیکن اس کا خطاب ہر اس فرد سے ہے جو وحی الٰہی پر ایمان رکھتا ہے اور قرآن کریم کو کلام الٰہی سمجھ کر پڑھتا ہے۔ یہاں اقراء کا مفعول محذوف ہے، اس لئے کہ فصیح کلام میں مفعول کو اس وقت حذف کر دیا جاتا ہے جب وہ بغیر ذکر کے مخاطب کے ذہن میں آجائے۔ یہاں الکتاب یا ما أنزل اللہ محذوف ہے جس سے مراد قرآن کریم ہے۔

قرآن حکیم کا غور سے مطالعہ کیجیے یہ دو باتوں کی طرف ہمارے مطالعے اور مشاہدے کو متوجہ کرتا ہے، ایک الکتاب ہے دوسرے الکون ہے۔ دونوں کا عمیق مطالعہ کرنا انسان کے لئے ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ الکتاب کا مطالعہ اور اس میں غور و فکر ہی ہمیں اس کائنات حتیٰ کہ ماورائے کائنات میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ الکتاب کتاب ہدایت ہے، انسانیت کو رشد و ہدایت کے لئے اس کتاب کو بار بار پڑھنا چاہئے، یہ علم کا ایسا چشمہ صافی ہے جس سے علوم کے چشمے مسلسل پھوٹتے رہتے ہیں، اس کتاب پر ایمان رکھنے والا جب بھی اس میں غور و فکر کرے گا علم کے نئے نئے نکات اور نئے نئے زاویے اس پر کھلتے رہیں گے۔ الکتاب ہی ہمیں اس کائنات میں غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ یہ کائنات اور اس میں جو کچھ ہے انسانوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اشیا سے فائدہ اٹھانے کے لئے تحقیق و جستجو کی ضرورت ہے۔ نیز اس کائنات میں چاند و سورج کے علاوہ بے شمار سیارے گردش کر رہے ہیں، زمانے میں مسلسل تغیرات آرہے ہیں۔ قرآن حکیم ہمیں ان حرکات و تغیرات کے مشاہدے کے ذریعے نہ صرف یہ کہ توحید و قدرت الٰہی پر استدلال و استنباط کی دعوت دیتا ہے بلکہ ان علوم و فنون کی طرف بھی

متوجہ کرتا ہے جو علم الافلاک اور علم الارض کے مطالعے کے نتیجے میں انسان کو حاصل ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کو ترقی کی راہ پر گامزن رکھنے میں مدد ملتی ہے، الکتاب کا مطالعہ فرض عین ہے، اور الکون کا مطالعہ فرض کفایہ ہے۔

اقراء کا لفظ پہلی وحی میں دو مرتبہ آیا ہے، تکرار مبالغے کا فائدہ دیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے جس قدر زیادہ سے زیادہ پڑھا جا سکے پڑھنا چاہئے۔ حصولِ علم کے لئے صرف پڑھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا جا سکتا، اس کے لئے باقاعدہ تعلیم وتربیت (Education) بھی ضروری ہے۔ تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کے لئے عَلَّم کا صیغہ بھی دو مرتبہ آیا ہے۔ عَلَّم بِالقَلَم، اور عَلَّمَ الانسان ما لَمْ یَعْلَمْ مقصد یہ ہے کہ اہل ایمان حصول علم کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں، اور علم کے میدان میں جس قدر آگے بڑھ سکتے ہیں بڑھنے کی کوشش کریں۔ علم تو صفتِ خداوندی ہے، اس کا جس قدر وافر حصہ اپنے اندر پیدا کر سکتے ہوں اس کے لئے کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ القلم حصول علم میں ایک آلے اور وسیلے کی حیثیت رکھتا ہے، اہل ایمان ہی القلم کے صحیح معنی میں حق دار ہیں۔ القلم وہ آلہ ہے جو تحریر کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنتا ہے، لہٰذا القلم سے مراد صرف قدیم زمانے کا کانے کا قلم ہی نہیں، اس کے مفہوم میں جدید دور کے پرنٹرز اور طباعتی مشینیں بھی داخل ہیں، ان اقلام کا موجد بھی مسلمان کو ہونی چاہئے اور علوم وفنون کی اشاعت کے لئے اس کے استعمال کی قوت وصلاحیت بھی مسلمان کو حاصل ہونا چاہئے۔ حصول علم کی راہ میں تمام ضروری آلات اور وسائل کا اختیار کرنا بھی فرض ہے۔ اس لئے کہ جب حصول علم فرض ہے تو حصولِ علم کے وسائل بھی فرض قرار پائیں گے۔ حالات، زمانے اور ضرورت کے مطابق وسائل کی تلاش اور ان کا حصول اسلامی معاشرے کے ذمے دار لوگوں کا فرض ہے۔ ہمارے فقہا نے اصول پر بحث کرتے ہوئے فتح الذرائع اور سدّ الذرائع کو ایک دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ (۳۱)

سورہ علق کی پانچویں آیت میں غور کیجیے تو اس میں بحث وتحقیق کی توجہ دلائی گئی ہے:

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

اللہ تعالیٰ انسان کو وہ علم عطا فرماتا ہے جو وہ نہیں جانتا۔

لہٰذا انسان کو اس علم کے ذریعہ جو اسے حاصل ہو چکا ہے اس علم تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہئے جو ابھی تک اس کے احاطہ علم میں نہیں آیا ہے۔ دیگر الفاظ میں آیت مبارکہ کی اس طرح وضاحت کی جا سکتی ہے کہ انسان کو معلوم کے ذریعے غیر معلوم کو دریافت کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے۔

انسان کی فکر ونظر کو سنوارنے، کردار کو نکھارنے اور عملی زندگی کو قانون واخلاق اور احکام الٰہی کے

مطابق ڈھالنے میں تعلیم کا ہمیشہ بنیادی کردار رہا ہے۔تمام انبیاء علیہم السلام نے معلم کا کردار ادا کیا ہے یہ ایسی بنیادی ضرورت بل کہ بنیادی حق ہے جو ہر شخص کے لئے فرض کا درجہ رکھتا ہے،کوئی فرد علم سے محروم نہیں رہنا چاہئے ۔علم کو ہر چیز پر فوقیت اور ترجیح حاصل ہے۔اسی لئے وحی الٰہی کا پہلا سبق علم،علم اور حصول علم ہے کہ اس کے بغیر نہ عقائد درست ہوتے ہیں، نہ عبادات صحیح طور پر ادا ہوتی ہیں،نہ معاملات درست ہوتے ہیں۔نہ ہی علم کے بغیر اجتماعی زندگی اور معاشرے میں رہن سہن کا ڈھنگ آتا ہے۔

دوسرا بنیادی فریضہ جسے رسالت مآب ﷺ نے ترجیحی بنیادوں پر انجام دیا وہ اصلاح فکر اور اصلاح رویہ کا فریضہ تھا۔اصلاح فکر اور اصلاح رویہ کا تعلیم و تربیت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔علم کی روشنی میسر نہ ہو تو پھر نہ انسانی فکر کی اصلاح کی جاسکتی ہے نہ ہی رویوں کو مثبت اور تعمیری انداز میں درست کیا جا سکتا ہے۔علم،اصلاحِ فکر اور اصلاحِ رویہ یہ تین ایسی مربوط کڑیاں ہیں کہ جن پر ایک مہذب معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ان میں سے کوئی ایک کڑی غائب ہو جائے تو معاشرہ بگاڑ اور زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اصلاحِ فکر کی آب یاری ایمان باللہ، ایمان بالرسالہ اور ایمان بالآخرہ سے فرمائی۔ایمان باللہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات، اس کے حقوق کا صحیح فہم پیدا فرمایا۔ توحید کی حقیقت کو اس طرح اجاگر فرمایا کہ انسان ماسویٰ اللہ کی غلامی سے آزادی کو محسوس کرنے لگا۔توحید اور صفات الٰہی کی وسعت و گہرائی کا ادراک اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کا شعور انسان میں پیدا ہوا، اور توحید باری تعالیٰ کی تعلیم کے نتیجے میں انسان میں عبدیت کا شعور بیدار ہوا۔اسی طرح عقیدہ رسالت کی تعلیم نے منصب نبوت کو سمجھنے اور انسانوں کی ہدایت و رہ نمائی کے لئے اور مقام نبوت کی حقیقت اور ضرورت کو جاننے اور ماننے میں بہت رہ نمائی کی۔خصوصا رسالت مآب سے ہمارے تعلق کی نوعیت خوب اجاگر ہوگئی۔ایمان بالآخرۃ کے ذریعے آخرت کی حقیقت، موت کے بعد کے احوال، بعث بعد الموت، حساب و کتاب، جزاء و سزا، جنت و دوزخ اور اخروی فلاح و سعادت کا شعور اجاگر فرمایا۔اس شعور کا گہرا اثر اہل ایمان کی عملی زندگی پر مرتب ہوا۔

جس طرح ایمان و عقیدے کے ذریعے فکری اصلاح کا اہتمام کیا، اسی طرح انسانی رویے کی اصلاح کے لئے اخلاقی اصولوں کا ایسا مجموعہ پیش فرمایا جن کے ذریعے انسان کے ظاہر اور باطن دونوں کی اصلاح ہو جاتی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے اخلاقی اصولوں کی تعلیم صحابہ کرام کو اس طرح فرمائی کہ ان کے نہ صرف یہ کہ باطن کا تزکیہ ہوا بل کہ ظاہری رویوں میں بھی بہت بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی۔فضائل اخلاق لوگوں کے مزاج کا حصہ بن گئے، ان کے رویے مکارم اخلاق کے مطابق ڈھل گئے۔اسلامی تہذیب اور

اسلامی معاشرے کا اصل ستون یہی ہیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں انہیں ہمیشہ ترجیحی بنیادوں پر اہمیت دی۔ مکی زندگی میں آغاز وحی سے اس کام کا آغاز ہوا اور آپ کی زندگی کے آخری سانس تک جاری رہا۔ علم، عقیدے اور اخلاق میں جب بھی ضعف پیدا ہوگا معاشرے میں بھی کمزوری کے آثار نمایاں ہو جائیں گے۔

مدنی دور کی بعض ترجیحات پر ایک نظر

مکی دور میں رسول اللہ ﷺ نے علم اور ایمان و اخلاق پر جو کام شروع کیا تھا وہ تو ساری زندگی تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ مدنی دور میں بھی پورے عزم و جذبے کے ساتھ لوگوں کو حصول علم پر آمادہ کیا جاتا رہا اور ایمان و اخلاق کے ذریعے ان کے افکار اور رویوں کی اصلاح کا کام جاری رہا۔ ان امور کو انجام دینے کے لئے اب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ علم سے آراستہ، مکارم اخلاق سے مزین اور تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ کی ایک پوری ٹیم تھی جو پوری تن دہی کے ساتھ ان امور کو انجام دینے میں رسول اللہ ﷺ کی معین و مددگار رہی۔

رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تو یہاں امن و امان کی صورت حال بہت خراب تھی۔ مسلمانوں کی تعداد انصار و مہاجرین دونوں کو ملا کر بھی یہودیوں اور دیگر غیر مسلم قبائل کے مقابلے میں بہت کم تھی، بعض قبائلی سرداروں کی قیادت و سیاست رسول اللہ کی آمد اور آپ کی مقبولیت کی وجہ سے زوال پذیر ہوگئی، یہودیوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کی قیادت کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا، لیکن رسالت مآب ﷺ کی حقانیت، اور ایمان و اخلاق کی قوت اور روشنی اس قدر زیادہ تھی کہ اب اس کے سامنے کھل کر آنا اور مخالفت کرنا ممکن نہیں رہا تھا، اس صورت حال میں بعض لوگوں نے نفاق کا روپ دھار لیا۔

رسول اکرم ﷺ نے یہاں کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی صورت حالات کے پیش نظر کچھ فیصلے ترجیحی بنیادوں پر فرمائے۔ ہم یہاں صرف دو فیصلوں پر بحث کریں گے۔

پہلا اہم فیصلہ دستور مدینہ کا نفاذ تھا۔ رسول اکرم ﷺ کی مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد ایک مدبرانہ کوشش یہ فرمائی کہ مدینہ منورہ اور اس کے قرب و جوار میں رہائش پذیر تمام گروہوں کو (یہود و نصاریٰ) کو خاص طور پر دعوت دی گئی کہ بعض مشترکہ اصولوں کی بنیاد پر مل جل کر رہنے اور باہمی تعاون پر تیار ہو جائیں۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے تیار کردہ دستور پر مختلف قبائل و مذاہب کے لوگوں کو اکٹھا

کرنے میں کام یابی ہوئی، اس دستور کی وجہ سے مدینہ منورہ میں ایک سیاسی وحدت قائم ہوگئی۔(۳۲)

یہودی قبائل اور بعض دیگر سرداران قبائل مسلمانوں اور رسالت مآب کی اخلاقی بالادستی کی وجہ سے شریک تو ہو گئے لیکن انہوں نے اخلاص و سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ دستور مدینہ پر دستخط کرنے کے باوجود انہوں نے مسلمانوں اور خود رسول اللہ ﷺ کے خلاف خفیہ سازشوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اگر یہودی قبائل دستور مدینہ کی روح کو سمجھتے اور مل جل کر باہمی امن وسکون سے رہتے تو یقیناً مدینہ منورہ میں ایسی مضبوط سیاسی وحدت قائم ہو جاتی جس میں مختلف مذاہب کے لوگوں کی باہم مل کر رہنے کی ایسی تاریخی مثال قائم ہو جاتی، جو آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی ایک بہترین نمونہ ہوتی اور شائد آج تاریخ اقوام و مذاہب بھی بہت مختلف ہوتی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی مملکت مختلف مذاہب و اقوام کے ساتھ بھی قائم ہو سکتی ہے۔ بہ ہر حال رسول اللہ ﷺ نے ان تمام سازشوں کے باوجود دستور مدینہ کو جاری و نافذ کر کے ایک منظم اور کام یاب مملکت اور معاشرے کا تجربہ دنیا کے سامنے پیش کیا، اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے لئے باہم امن کے ساتھ رہنے کا ایک مثالی نمونہ پیش فرمایا۔

دوسرا اہم ترین فیصلہ مواخاۃ کا عمل تھا۔ اگر چہ مواخاۃ کا تجربہ مکی دور میں بھی ہوا تھا، لیکن مکی دور کے مواخاۃ کے اسباب اور مقاصد بالکل مختلف تھے۔(۳۳) مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد بعض حضرات نے محسوس کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی پرکشش شخصیت اور کردار و اخلاق کی بالادستی کی وجہ سے ان کی اپنی سیاست اور حکم رانی کے خواب دھندلا گئے ہیں تو وہ مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشوں میں مبتلا ہو گئے، اور مسلمانوں کے گروہوں میں علاقائی یا تہذیبی فرق کو نمایاں کر کے ان میں اختلاف پیدا کرنے کی کوششوں میں لگ گئے، خصوصاً عبداللہ بن ابی نے انصار و مہاجرین کے درمیان بدگمانیاں پھیلا کر باہم تفریق پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی تو رسول اللہ ﷺ نے صحرائی و بدوی تہذیب اور زرعی تہذیب و ثقافت کے فرق کو ختم کرنے کے لئے اور عقیدے و اخلاق کی بنیاد پر ایک نئی تہذیب اجاگر کرنے کے لئے انصار و مہاجرین کے درمیان مواخاۃ کرا دی۔ مسلمان باہم شیر و شکر ہو کر رہنے لگے۔ اس طرح عبداللہ بن ابی اور بعض دیگر منافقین نے جو چال چلنے کی کوشش کی تھی وہ ناکام ہوگئی۔

۶۔ تدریج (Gradualism)

تدریج کا اصول عہد رسالت کے فیصلوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اس اصول کے اطلاق کا مقصد یہ تھا کہ معاشرے میں قانون سازی کے عمل یا نئے تصورات و تغیرات کو متعارف کرانے میں تدریج کے

اصول کو پیش نظر رکھا جائے، تا کہ لوگ نہ صرف یہ کہ فکری طور پر اسے قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، بل کہ عملی طور پر بھی اس کے نفاذ یا قیام میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تدریج کا اصول قرآن حکیم کے نزول سے اخذ کیا ہو۔ قرآنِ حکیم بہ تدریج تیئس برس میں آپ ﷺ پر نازل ہوا۔ قرآن کریم کے مضامین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ارتقائی مراحل میں تدریج کا اصول کارفرما رہا ہے۔ اس کے احکام اور اوامر ونواہی کا مطالعہ کیجیے تو وہاں بھی ارتقائی مراحل میں تدریج کا اصول نظر آتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے خود تدریج کی حکمت کو دو جگہ بیان کیا ہے، سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ○ (۳۴)

ہم نے قرآن کریم کو تھوڑا تھوڑا اتارا تا کہ آپ ﷺ لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سنائیں، اور ہم نے قرآن کو بہ تدریج ہی نازل کیا ہے۔

سورہ فرقان میں اس کی حکمت یہ ارشاد فرمائی:

كَذٰلِكَ ج لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ○ (۳۵)

ہم نے اسی طرح تدریجاً نازل کیا تا کہ آپ کے دل پہ یہ قرآن نقش ہو جائے، اور ہم ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھ کر سناتے ہیں۔

فطرت کے سارے کاموں میں تدریج کا اصول کارفرما نظر آتا ہے، حال آں کہ اللہ تعالیٰ کو مکمل قدرت حاصل ہے وہ جس چیز کو وجود بخشنا چاہے محض ''کن'' کہنے پر وجود میں آسکتی ہے، لیکن اس قدرتِ کاملہ اور قدرت تامہ کے باوجود ارض وسما کی تخلیق چھ دنوں میں ہوئی، یہ چھ دن کتنے لمبے تھے یہ کہنا مشکل ہے، بہ ظاہر تو ایک دن ہزار برس کے برابر معلوم ہوتا ہے۔ (۳۶) اس طرح ارض وسما کی تخلیق چھ ہزار برس میں ہوئی۔ درختوں کو پھل دینے اور کھیتوں کے پھلنے پکنے میں بھی تدریج کا اصول واضح طور پر نظر آتا ہے۔ شراب کی حرمت ہو یا نمازوں کی فرضیت، جہاد کے احکام ہوں یا دستوری اداروں کا قیام ہر جگہ تدریج کا اصول مدنظر رکھا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا اپنا طرز عمل بھی اصول فطرت کے مطابق رہا ہے۔ آپ پہلے لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کیا کرتے تھے، پھر عمل کی دعوت دیتے تھے۔ دعوتِ دین اور تعلیم کے لئے جن لوگوں کو مقرر فرماتے انہیں بھی اس ہدایت کے ساتھ روانہ فرماتے تھے کہ پہلے لوگوں کو ایمان کی دعوت دینا، جب وہ ایمان قبول کرلیں تو پھر نماز کی تعلیم دینا اور اس کے بعد زکوۃ کی ادائیگی کا حکم دینا۔ (۳۷)

تدریج کے اصول میں حکمت دین کا لطیف پہلو پنہاں ہے۔ قرآن کریم کی بعض آیات میں بہت لطیف انداز میں اشارات ملتے ہیں، مثلاً سورہ بقرہ کی آیت:

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (۳۸)

اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل کیا، پھر اس پانی سے تمہارے لئے رزق پیدا کیا۔

اللہ تعالیٰ پہلے بارش کے اسباب پیدا فرماتا ہے، سمندروں سے اٹھنے والے آبی بخارات بادلوں کی شکل اختیار کرتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ ہواؤں کے ذریعے ان بادلوں کو مختلف علاقوں میں پھیلا دیتے ہیں پھر ان بادلوں سے بارش ہوتی ہے تو مردہ زمینوں میں نئی زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں فصلیں پیدا ہوتی ہیں، باغات لگتے ہیں جن سے انسانوں کو رزق میسر آتا ہے۔ اس قسم کی آیات میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تدریج میں ماحول اور معاشرے دونوں کے لئے دیرپا منافع ہیں۔ (۳۹)

۷۔ تیسیر (Facilitation)

شریعت انسانی مزاج، احساسات اور قوت واستطاعت کا خیال رکھتے ہوئے احکام عطا کرتی ہے۔ شریعت کے عطا کردہ احکام وقوانین اور دیگر فیصلوں میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اہل ایمان کے لئے کوئی ایسا حکم جاری نہ کیا جائے جس کو پورا کرنا یا جس پر عمل کرنا انسانی استطاعت سے باہر ہو۔ یہ اصول سورہ بقرہ کی اس آیت مبارکہ سے مستنبط ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (۴۰)

اللہ تعالیٰ تمہارے لئے سہولت اور آسانی چاہتے ہیں، مشقت اور سختی نہیں چاہتے۔

اسی طرح ارشاد ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۴۱)

اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی استطاعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں یہ اصول بہت واضح طور پر نظر آتا ہے۔ آپ نے خود اپنے بارے میں فرمایا:

ولكني بعثت بالحنيفية السمحه (۴۲)

اللہ تعالیٰ نے مجھے معتدل اور آسان دین کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت پر غور کیجیے:

ان الدین یسر ولن یشاد الدین احدٌ الاغلبه ، فسدِدوا وقاربوا وأبشروا واستعینوا بالغدوة والروحة و شئ من الدلجة (۴۳)

یقیناً دین آسان ہے۔ جو شخص دین میں شدت اختیار کرے گا تو دین اس پر غالب آجائے گا۔ لہٰذا اعتدال کی راہ اختیار کرو، اور میانہ روی کے قریب رہو، خوش خبری لوگوں کو سناؤ اور صبح و شام اور رات کے کچھ حصے میں نمازوں سے تقویت حاصل کرو۔

اصول تیسیر کو یقینی بنانے کے لئے رسول اللہ ﷺ باقاعدہ ہدایات جاری فرماتے تھے۔ آپ جب اپنے بعض صحابہ کرام کو انتظامی ذمے داریاں سونپتے اور انہیں دیگر علاقوں میں روانہ فرماتے تو انہیں خاص طور پر ہدایت فرماتے کہ وہ لوگوں کے ساتھ نرمی برتیں، سہولت اور آسانی کا راستہ اختیار کریں، سختی اور مشقت میں ہرگز نہ ڈالیں (۴۴) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن مین عدالتی اور انتظامی ذمے داریاں دے کر روانہ فرمایا تو انہیں بھی صریح الفاظ میں یہ ہدایت کی:

یَسّرا ولا تعسرا، بشرا ولا تنفرا(۴۵)

لوگوں کو سہولت مہیا کرنا، انہیں مشقت میں نہ ڈالنا، خوش خبری سنانا متنفر نہ کرنا۔

شریعت تو انسانوں کے لئے سہولت کا اس قدر خیال رکھتی ہے کہ اگر عبادات میں بھی کسی فرد کو مشقت اور دشواری پیش آنے لگے تو اس کے لئے عبادات میں بھی تخفیف کر دی جاتی ہے۔ تخفیف کا قاعدہ نمازوں میں بھی جاری ہوتا ہے اور روزوں میں بھی۔ سہولت و تخفیف کے قانون کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہا نے یہ قاعدہ وضع کیا ہے:

المشقة تجلب التیسیر (۴۶)

مشقت سہولت کو پیدا کرتی ہے۔

فقہائے کرام نے قرآن حکیم کی مذکورہ آیات اور رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں بہ طور اصول یہ کلیہ پیش کیا ہے کہ قانون سازی، احکام اور حکومتی فیصلوں میں مفاد عامہ (public Interest) کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس قاعدے کی تطبیق اس طرح کی جائے گی کہ سب سے پہلے اگر کوئی دشواری، مشقت یا ضرر در پیش ہو تو اسے دور کیا جائے گا، یہ دفع الضرر یا رفع الحرج کہلاتا ہے، اور اگر کوئی ضرر یا دشواری حائل نہ ہو تو پھر انسانی مصلحتوں کی رعایت کی جائے گی، یہ پہلو جلب المصلحہ کہلاتا ہے۔ (۴۷)

تیسیر کے اصول سے ایک بات اور واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ اسلام ایک عالم گیر دین ہے، اس میں مکمل توازن ہے، اعتدال ہے اور یہ کہ یہ دین افراط و تفریط، شدت اور غلو سے پاک ہے، یہ دین وَسَط ہے

اس کے پیروکاروں کا فرض ہے کہ وہ پورے اعتدال اور توازن کے ساتھ شہادتِ حق کا فریضہ انجام دیتے رہیں۔(۴۸)

۸۔محاسبہ یا خود احتسابی(Self Evaluation)

ترقی کے مراحل طے کرنا انسان کی فطری خواہش ہے۔ ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی میں مسلسل ارتقا ہوتا رہے، ہر لحہ خوب سے خوب تر کی طرف بڑھتا رہے۔ اس کا ہر عمل اور ہر قدم کمال کی جانب اٹھتا رہے۔ یہ ایسی خواہش ہے کہ اگر صحیح رہنمائی میسر ہو تو ارتقا خیر و بھلائی کے لئے ہوسکتا ہے۔لیکن اگر صحیح رہنمائی نہ ہو تو انسان حصول مفادات کے لئے غلط راہوں کو بھی اپنا لیتا ہے۔قرآن کریم بھلائی اور نیکی کے کاموں پر خوب آمادہ کرتا ہے۔سورہ الحدید میں ہے:

سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۴۹)

تم اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف سبقت لے جانے کی سعی کرو جس کی چوڑائی زمین وآسمان کی چوڑائی کی طرح ہے۔

سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:

فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ (۵۰)

تم بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جاؤ۔

اللہ کے نازل کردہ احکام میں انسانوں کے لئے آزمائش کا پہلو ہے۔اگر انسان کی نظر اچھے کاموں پر جمی رہے تو وہ کامیاب رہتا ہے، اسی لئے کہا گیا ہے:

وَّ لٰکِنْ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ، فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ (۵۱)

لیکن اللہ تعالیٰ تمہیں کتاب و احکام دے کر آزماتا ہے۔لہٰذا تم اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔

سورہ فاطر میں نیکی کے کاموں میں سبقت لے جانے والوں کو اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم حاصل کرنے والا بتایا گیا ہے۔(۵۲) سورۂ توبہ میں انصار و مہاجرین میں جو سابقون اولون رہے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا اور جنت کی دائمی نعمتوں کی بشارت دی ہے۔(۵۳) سورۂ مؤمنون میں ان لوگوں کے لے جن کے دل خشیت الٰہی سے لبریز ہوں، جو اللہ تعالیٰ کی آیات پر مضبوط ایمان رکھتے ہوں، جو ہر قسم کے شرک سے اجتناب کرتے ہوں اور جو اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال میں سے اللہ کی راہ میں اس طرح

خرچ کرتے ہوں کہ دلوں میں خوف بھی ہو کہ انہیں اپنے رب ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن حکیم کہتا ہے:

اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ

یہی وہ لوگ ہیں جو بھلائی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں، اور وہ نیکی کے کاموں میں سبقت لے جانے والے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دین اسلام ہمیں دنیا میں بھلائی اور خیر کے کام انجام دینے پر کس قدر ابھارتا ہے، اس دنیا میں ارتقا اور حصول کمال کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ انسان مسلسل جدوجہد کرتا ہے، اس کا ہر قدم کمال کی جانب بڑھتا رہے۔ یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب انسان اپنے حالات اور اپنے اعمال و کردار کا بھرپور جائزہ لینے کا عادی ہو۔ دین و شریعت کا ہر فرد سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ علمی، فکری، اخلاقی اور روحانی ارتقا کی طرف پیش قدمی کرتا رہے۔ لہٰذا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتا رہے اور جس شعبے میں بھی کم زوری یا خامی نظر آئے اسے دور کرنے کے لئے تمام اسباب و ذرائع استعمال کرے جو اسے میسر ہوں یا جنہیں وہ حاصل کر سکتا ہو۔ یہی صورت انسانی اعمال کی ہے۔ ہر انسان کو اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے رہنا چاہئے۔ کیوں کہ محاسبے کے بغیر اعمال میں حسن و نکھار پیدا نہیں ہوتا، نہ ہی انسان میں ارتقائی مراحل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے والا ہر صاحب ایمان محاسبے کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اس کی نظر سے بار بار وہ آیات گزرتی ہیں جن میں اعمال کے حساب و کتاب کا ذکر ہے، مثلاً:

اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَ هُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ○ (۵۴)

یاد رکھئے حکم صرف اللہ تعالیٰ کا چلے گا۔ اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ○ (۵۵)

(روز قیامت) ہم عدل و انصاف کے پیمانے قائم کر دیں گے، پھر کسی فرد پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جا سکے گا، اور ہم کافی ہیں حساب لینے کے لئے۔

وَ اللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ وَ هُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○ (۵۶)

اور اللہ تعالیٰ ہی فیصلہ کرتا ہے، اس کے حکم کو کوئی طاقت رد نہیں کر سکتی، وہ جلدی حساب لینے

والا ہے۔ یقینی بات ہے کہ جس فرد کو اللہ رب العالمین کی بارگاہ میں اپنے ہر ہر عمل کا حساب وکتاب دینے کا یقین ہو وہ اس دنیا میں ضرور اپنا محاسبہ کرے گا۔

یہ چند آیات بہ طور نمونہ ہم نے نقل کی ہیں ورنہ اس مفہوم کی آیات بے شمار ہیں جو بار بار انسان کو اپنا، اپنے اعمال اور اپنے حالات کا محاسبہ کرتے رہنے پر آمادہ کرتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کی تربیت اس طرح فرمائی تھی کہ وہ ہر روز اپنا محاسبہ کرتے تھے حضرت حنظلہ کا واقعہ مشہور ہے، انہوں نے اس بات کا جائزہ لیا کہ رسول اللہ ﷺ کی محفل میں ہمارے دلوں کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ اپنے گھروں میں اور بیوی بچوں میں گھل مل کر باقی نہیں رہتی۔ شداد بن اوس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الکیس من دان نفسه، وعمل لما بعد الموت، والعاجز من اتبع نفسه هواها تمنی علی الله، قال هذا حدیث حسن، قال و معنی قوله من دان نفسه یقول یحساب نفسه فی الدنیا قبل ان یحاسب یوم القیمة

عقل مند انسان وہ ہے جس نے اپنے نفس کی حفاظت کی اور موت کے بعد کی زندگی کی تیاری کی، اور وہ شخص عاجز ولاچار ہے جس نے اپنے نفس کی پیروی کی اور اللہ تعالیٰ سے آرزوئیں باندھتا رہا۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔ اور آپ ﷺ نے جو یہ فرمایا **من دان نفسه** تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے اس سے پہلے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کا محاسبہ کریں۔ حضرت عمرؓ سے اثر منقول ہے، فرماتے ہیں:

حاسبوا أنفسکم قبل أن تحاسبوا، وتزینوا للعرض الاکبر، و انما یخفف الحساب یوم القیمة علی من حاسب نفسه فی الدنیا

آخرت میں لئے جانے والے حساب وکتاب سے پہلے دنیا میں ہی اپنا محاسبہ کرتے رہا کرو اور بڑے دن کی پیشی کے لئے تیاری کرو، اس لئے کہ جو شخص دنیا میں اپنا محاسبہ کرتا رہتا ہے قیامت کے دن اس کا حساب وکتاب آسان ہوگا۔

مہران بن میمونؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنا محاسبہ نہیں کرتا وہ کبھی متقی نہیں ہوسکتا۔ (۵۷) گویا تقوے کا حقیقی مقام حاصل کرنے والے وہی حضرات ہوسکتے ہیں جو اپنے اعمال وکردار پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

ایک روایت جسے عام محدثین نے تو نقل نہیں کیا ہے لیکن صوفیا کے ہاں یہ روایت مقبول ہے، البتہ

معنوی لحاظ سے وہ روایت مذکورہ بالا روایات کی تائید کرتی ہے۔ الخطیب البغدادیؒ کی کتاب اقتضاء العلم العمل میں یہ روایت موجود ہے، جسے ناصر الدین البانی نے اپنی تحقیق کے ساتھ شائع کیا ہے۔ انہوں نے اس روایت کو حضرت عمرؓ کے ماثور کے طور پر نقل کیا ہے۔ روایت یہ ہے:

من استوی یوماہ فھو مغبون، و من کان امسہ خیر من یومہ فھو محروم(۵۸)

جس شخص کے دو دن یک ساں گزریں تو وہ نقصان میں ہے، اور جس شخص کا گزرا ہوا دن آج کی بہ نسبت بہتر ہو تو وہ محروم ہے۔

ایک روایت میں محروم کی جگہ ملعون کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ اس روایت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان کو ہر وقت اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہئے۔ مطلوب یہ ہے کہ ہر آنے والا دن پہلے دن سے بہتر ہونا چاہئے۔ ہر بعد والا عمل پہلے عمل کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہونا چاہئے۔ گویا انسان کی شخصیت، اس کی فکر، اس کے اعمال وغیرہ میں مسلسل ارتقا ہوتا رہنا چاہئے، اس ارتقا میں رکاوٹ مؤمن کے لئے محرومی ہے، بل کہ جمود کا طاری ہونا موت کے مترادف ہے، لہٰذا مؤمن کو تو بھرپور زندگی کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ جب انسان کی شخصیت کی مذکورہ صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے تو اس کا اثر اس کے اعمال وافعال اور اقوال پر بھی پڑتا ہے۔ اعمال کا تعلق چاہے عبادات سے ہو یا معاملات سے، معاشی جدوجہد سے ان کا تعلق ہو یا انتظامی امور اور سیاستِ مملکت سے، ہر عمل میں بہتری اور ارتقا کی صورتیں نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ انسان کو ہمیشہ بہتر سے بہتر کی تلاش رہنی چاہئے۔ فلاح وسعادت کے حصول، اور دنیوی واخروی کام یابی کے لئے ہر لحظہ ہر لحہ مثبت اور تعمیری جدوجہد جاری رہنا چاہئے جس کے صالح اثرات اور مفید نتائج نظر آنے لگیں:

وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (۵۹)

بھلائی کے کام کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

یہ کام اسی وقت ممکن ہوگا جب ہر فرد اپنا ناقدانہ جائزہ لینے کا عادی ہو جائے، اور برائیوں کو بھلائی کے ذریعے ختم کرنے کا خوگر ہو جائے۔

اسوہ حسنہ سے ماخوذ یہ وہ بنیادی اصول ہیں جو نہ صرف ہمارے دستوری اور قانونی نظام کے لئے راہ نمائی مہیا کرتے ہیں بل کہ نظم مملکت اور مملکتی اداروں کے لئے بھی واجب العمل رہنما اصول ہیں:

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْھِمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ

اور اللہ کے رسول کی زندگی ہی تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ الاحزاب: ۲۱

۲۔ ابن کثیر۔ تفسیر القرآن العظیم۔ دارالنھضۃ العربیۃ، بیروت ت ن: ج ۳، ص ۴۵۷

۳۔ ابن ہشام۔ السیرۃ النبویہ۔ مصطفی البابی، قاہرہ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء: ج ۱ ص ۳۴۴

۴۔ ابن ہشام: ج ۱ ص ۳۵۴

۵۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۳۵۸

۶۔ ابن ہشام، ج ۱ ص ۳۵۹۔ فاروقی، محمد یوسف۔ عہد رسالت میں معاشرہ اور مملکت کی تشکیل۔ اظہار القرآن، لاہور ۲۰۰۶: ص ۱۸۳

۷۔ عبدالحی الکتانی۔ التراتیب الاداریۃ۔ حسن جعنا، بیروت، ت ن: ج ۲ ص ۱۶۳، ۱۶۴۔ عہد رسالت میں معاشرہ اور مملکت کی تشکیل: ص ۸۱۔۸۴۔ معلومات کے حصول کا تیسرا ذریعہ مکہ مکرمہ کے وہ تاجر تھے جو تجارتی سامان لے کر دور دراز ممالک کا سفر کیا کرتے تھے، ان میں بہت سے تاجر وہ تھے جو اسلام قبول کر چکے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے دعوتی مشن کے ساتھ وابستہ تھے۔

۸۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۷۰۔ عہد رسالت میں معاشرہ اور مملکت کی تشکیل: ص ۸۲۔ اکرم ضیاء العمری۔ سیرت رحمت عالم۔ مترجم خدا بخش کلیار۔ نشریات، لاہور ۲۰۰۷: ص ۲۱۶

۹۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۷۳۔۷۵

۱۰۔ ابن ہشام: ج ۲ ص ۸۱۔۸۵۔ احمد بن حنبل۔ المسند: ج ۵، ص ۳۱۶۔ الطبری۔ تاریخ الرسل والملوک۔ دارالمعارف، قاہرہ ۶۳، ۱۹۶۱۔ بیعت عقبہ اولیٰ کے لئے دیکھئے: ج ۲، ص ۵۶۔۳۵۵ اور بیعت عقبہ ثانیہ کے لئے دیکھئے: ص ۳۶۲۔۳۶۴۔

۱۱۔ محمد حمید اللہ۔ عہد نبوی کا نظام حکمرانی۔ مقالہ دنیا کا سب سے پہلا دستور: ص ۷۵

۱۲۔ عہد رسالت میں معاشرہ اور مملکت کی تشکیل: ص ۵۸۔ سفارتی نظر کے لئے: ص ۱۸۲

۱۳۔ غزوات کے سلسلے میں منصوبہ بندی کے اصول کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے دیکھئے محمد حمید اللہ، عہد نبوی کے میدان جنگ (علمی مرکز، راولپنڈی ۱۹۹۸)

۱۴۔ المؤمنون: ۱۱۵

۱۵۔ ص: ۲۷

۱۶۔ طہ: ۱۴

۱۷۔ العنکبوت: ۴۵

۱۸۔ بخاری۔ الجامع الصحیح: کتاب الآذان، باب الآذان للمسافرین، حدیث نمبر ۶۳۱۔ احمد بن حنبل۔ المسند: ج ۵

ص ۵۲

۱۹۔ ابن کثیر: ج ۳، ص ۴۰۰

۲۰۔ الحج ۳۲

۲۱۔ ترمذی۔ جامع الترمذی۔ أبواب البر والصلہ۔ باب ما جاء فی شفقۃ المسلم علی المسلم۔ ح ن۔ ۱۹۲۷

۲۲۔ الحج: ۳۲ نیز دیکھئے: البقرہ: ۲۰۳۔ الحج: ۳۷

۲۳۔ البقرہ: ۱۹۷

۲۴۔ البقرہ: ۱۹۸۔ ۲۰۰۔ ۲۰۳

۲۵۔ دیکھئے: آل عمران۔ ۱۵۹۔ الشوریٰ۔ ۳۷۔ ۳۸

۲۶۔ القرطبی۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد۔ الجامع لأحکام القرآن۔ دار الکتاب العربی، بیروت ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷: ج ۴، ص ۲۴۹

۲۷۔ اخلاص کے لئے دیکھئے: النساء۔ ۱۴۶۔ الزمر۔ ۲۔ الأعراف۔ ۲۹۔ علمی بنیادوں پر جو بات کہی جائے اسے مان لینا چاہئے: الرعد۔ ۳۷۔ الجاثیہ۔ ۱۷۔ دلیل اور بینہ کی اہمیت کے لئے دیکھئے: البینہ۔ ۱، ۴۔ البقرہ۔ ۲۱۳۔ الأنفال۔ ۴۲

۲۸۔ اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے روایت کیا ہے، دیکھئے: ابوداؤد۔ السنن: کتاب الأدب، باب فی المشورۃ، حدیث نمبر ۵۱۲۸۔ ترمذی: کتاب الأدب، باب ما جاء إن المستشار مؤتمن، حدیث نمبر ۲۸۲۲۔ ابن ماجہ۔ السنن: کتاب الأدب، باب مستشار مؤتمن، حدیث نمبر ۳۷۴۵، ۳۷۴۶

۲۹۔ ابوحیان، اثیر الدین۔ البحر المحیط۔ دار الفکر، بیروت ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳: ج ۷، ص ۵۲۲

۳۰۔ ابن ماجہ: باب فضل من تعلم القرآن وعلمہ، حدیث نمبر ۲۲۴

۳۱۔ وہبہ الزحیلی۔ اصول الفقہ الاسلامی۔ دار الفکر، دمشق ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء: ج ۲، ص ۸۷۳: فاروقی، محمد یوسف۔ اجتہاد۔ مناہج واسالیب: ص ۶۶۔ ۶۹

۳۲۔ محمد حمید اللہ۔ عہد نبوی کا نظام حکمرانی۔ اردو اکیڈمی، سندھ ۱۹۸۱۔ دنیا کا پہلا تحریری دستور: ص ۷۵۔ ۱۰۶۔ نیز دستور مدینہ کے مصادر کے لئے دیکھئے: محمد حمید اللہ۔ مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ۔ دار النفائس، بیروت، ۱۹۸۳ء

۳۳۔ مواخاۃ مکی کی وضاحت کے لئے دیکھئے: مقالہ مواخاۃ، پس منظر اور معاشرہ پر اس کے اثرات۔ عہد رسالت میں معاشرہ اور مملکت کی تشکیل: ص ۵۸

۳۴۔ بنی اسرائیل: ۱۰۶

۳۵۔ الفرقان: ۳۲

۳۶۔ الحج: ۴۷

۳۷۔ مسلم: کتب الایمان، باب الدعاء إلی الشہادتین وشرائع الاسلام، حدیث نمبر ۱۲۱، ۱۲۳

۳۸۔ البقرہ: ۲۲

۳۹۔ سورہ الاعراف: ۵۷ کا غور سے مطالعہ کیجیے۔

۴۰۔ البقرہ: ۱۸۵

۴۱۔ البقرہ: ۲۸۶

۴۲۔ احمد بن حنبل۔ المسند: ج ۵، ص ۲۶۶، ج ۶ ص ۱۱۶۔ امام بخاریؒ نے اپنی الجامع الصحیح میں کتاب الایمان میں باب قائم کیا ہے الدین یسر، اس کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے: **أُحبّ الدین إلی اللہ الحنفیة السمحه**، اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ دین وہ ہے جس میں حق ہو اور سہولت ہو۔

۴۳۔ بخاری: کتاب الایمان باب الدین یسر

۴۴۔ مسلم: کتب الجہاد والسیر، باب فی الامر بالتیسیر، حدیث نمبر ۴۵۲۵

۴۵۔ مسلم: کتب الجہاد والسیر، باب فی الامر بالتیسیر، حدیث نمبر ۴۵۲۶

۴۶۔ دیکھئے: مجلۃ الأحکام العدلیۃ۔ مادہ ۱۷۔ ابن نجیم۔ الأشباہ والنظائر۔ مکتبہ نزار مصطفی، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ / ۱۹۹۷ء: ج ۱ ص ۷۷

۴۷۔ تفصیلات کے لئے مقاصد الشریعہ کی بحث کا مطالعہ کیجیے: عز الدین۔ قواعد الأحکام۔ الشاطبی۔ الموافقات

۴۸۔ امت وَسَط کی مزید وضاحت کے لئے دیکھئے: عہد رسالت میں معاشرہ اور مملکت کی تشکیل: ص ۹۳

۴۹۔ الحدید: ۲۱

۵۰۔ البقرہ: ۱۴۸

۵۱۔ المائدہ: ۴۸

۵۲۔ الفاطر: ۳۲

۵۳۔ التوبہ: ۱۰۰

۵۴۔ الانعام: ۶۲

۵۵۔ الانبیاء: ۴۷

۵۶۔ الرعد: ۴۱

۵۷۔ مذکورہ تمام روایات و آثار کے لئے دیکھئے، ترمذی: کتاب صفۃ القیامۃ، باب حدیث الکیس من دان نفسہ۔ امام احمد حنبلؒ ایک روایت اس طرح نقل کرتے ہیں: کل امرئ حسیب نفسہ ہر شخص خود اپنا محاسب ہے۔ دیکھئے المسند: ج ۳، ص ۳۰۵

۵۸۔ الخطیب البغدادی۔ اقتضاء العلم۔ تحقیق ناصر الدین البانی۔ المکتب الاسلامی، بیروت ۱۳۹۷ھ: ص ۱۱۲۔ ابو شجاع شیرویہ۔ الفردوس بمأثور الخطاب: ج ۳ ص ۶۱۱

۵۹۔ النجم: ۷۷